محمد بدر عالم*

”کچھ تو سمجھے خدا کرے کوئی“

[افتراق وتفریق کا فکری، نفسیاتی اور سماجی تجزیہ-۱]

امت مسلمہ اس وقت گوناگوں مسائل کا شکار ہے۔ عالمی کفر نے ہر طرف سے اس کو شکنجے میں کس لیا ہے۔ ہم معاشی طور پر خدایانِ مغرب کے محتاج اور عسکری طور پر ان کفار کے دست نگر ہیں۔ ہم ان کے سیاسی قیدی اور تہذیبی غلام ہیں۔ جمہوری نظام ہماری آنکھوں کا تارا اور بے دین معاشرت ہمارے سروں کا تاج ہے۔ حالات دِل فگار ہیں۔ ملت کا اجتماعی ڈھانچہ بالکل ٹوٹ چکا ہے۔ معدودے چند افراد کے سوا جو امت کی ڈوبتی ناؤ بچانے کی کوشش کر رہے ہیں، بہت بڑی اکثریت صرف اپنے مفادات کی سوداگر ہے۔ مفکروں کی دانش بانجھ اور فکر مردہ ہو چکی ہے۔ حکمران اگر کاسہ لیس اور عیار ہیں تو سیاستدان ٹوڈی اور مکار ہیں۔ عدالتیں انصاف بیچتی ہیں اور صحافی حرمتِ قلم کا بیوپار کرتے ہیں۔ شعرا اگر کلام کے جادوگر ہیں تو خطبا لفظوں کے بازی گر ہیں۔ غریب کا دامن زر سے اور امیر کا دل ضمیر سے خالی ہے۔ مزدور کی محنت زر بن کر کارخانہ دار کی تجوری میں اتر جاتی ہے اور حالات کے جبر سے نکلنے والی اس کی کراہیں دھواں بن کر کارخانے کی چمنیوں سے نکلتی جاتی ہیں۔ کافروں کے ٹکڑوں پر پلنے والے چند بے ضمیروں نے پوری امت کو ان کے پاس گروی رکھ دیا ہے۔ حالات بد سے بدتر اور زوال مزید سے مزید تر ہو جا رہا ہے۔

امت حالات کے ایسے گرداب میں پھنسی ہوئی ہے جس سے نکلنے کا کوئی راستہ سجھائی نہیں دے رہا۔ حالات دیکھ کر لگتا ہے کہ اللہ کی اس زمین پر خونِ مسلم سے ارزاں اور کوئی چیز نہیں۔ تڑپتے جسم، بھڑکتے وجود، بے گور و کفن لاشیں، لٹے سہاگ، پٹی عصمتیں، اجڑے دیار، ویران بستیاں، مظلوموں کی فریادیں، بندوقوں کے قہقہے، گولیوں کی مسکراہٹیں، بارود کی بارش، اِس سمت سے اُس سمت تک مسلمان کا لہو۔ کیا یہی ملت کا مقدر اور اس کا نصیب ہے؟ یہ دلدوز حالات دیکھ کر آنکھیں خون آلود ہو جاتی ہیں اور سوچ سوچ کر کنپٹیاں سلگتی ہیں۔ دماغ پھٹتا ہے اور ہر دردمند دل پریشان اور غمگین ہو جاتا ہے۔

جس طبقے سے ناخدائی کی امید کی جا سکتی تھی، وہ باہم دست و گریباں ہے۔ اس کی صلاحیتیں کسی اور کام پر صرف ہو

* ibntaqi1970@gmail.com

رہی ہیں۔ بہت سے دوسرے افراد کی طرح راقم بھی اس پر سوچتا رہتا ہے کہ امت کے اس زوال وادبار کا سبب کیا ہے؟ ہم دوبارہ عروج کس طرح حاصل کر سکتے ہیں؟ قیادت کا فخر اور سیادت کا شرف جو ہمارا اثاثہ تھا، کس طرح واپس لیا جا سکتا ہے؟ یہ مسئلہ امت کے لیے رستا ہوا ناسور اور سلگتا ہوا انگارہ ہے۔ ہر دردمند مسلمان کا دل اس کی ٹیس سے تڑپتا اور اس کی تپش سے جلتا ہے۔ اس مسئلے پر بات کرنا گھاؤ پر نشتر لگانا اور سانپ کے ڈسے ہوئے کو آک کا دودھ پلانا ہے۔ گمان تو اچھا رکھنا چاہیے، مگر پھر بھی اس مضمون سے ہو سکتا ہے کسی قبا کے بخیے ادھڑ جائیں، کسی عمامے کے پیچ کھل جائیں، کوئی گریباں چاک ہو جائے، اس لیے تیوریوں کا چڑھنا، پیشانیوں کا شکن آلود ہو جانا اور زبانوں کا میرے حق میں بے لگام ہو جانا ممکن ہے، لیکن ستائش کی تمنا اور صلے کی پروا کیے بغیر اس بات کا اظہار کرنا خود پر فرض اور امت کا قرض سمجھتا ہوں جو میرے نزدیک حق و درست ہے۔

اس وقت امت کو جن مسائل کا سامنا ہے، ان میں ''فرقہ واریت'' کا مسئلہ اہم ترین ہے۔ بہت سے لوگ اسے امت کے زوال کا سبب سمجھتے ہیں۔ اس سے کلی طور پر تو میں اتفاق نہیں کرتا، البتہ یہ یقین ضرور رکھتا ہوں کہ عروجِ امت کے راستے میں یہ ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ فرقہ واریت کے علاوہ اور ایک چیز بھی ہے جو نتائج کے لحاظ سے اگرچہ اس سے کم مہلک نہیں، مگر اس کی طرف بہت کم لوگوں کی نظر اٹھتی ہے۔ جو اس کی طرف توجہ کرتے ہیں، وہ بھی اس کی سنگینی کو مکمل طور پر محسوس نہیں کر پاتے۔ نوعیت کے لحاظ سے یہ فرقہ واریت ہی کی فرع اور شاخ ہے۔ اس کا نام ہم ''تفریق'' رکھتے ہیں۔

زوال کے اس دور میں عروج سے ہمکنار ہونے کے لیے مختلف النوع کوششیں ہو رہی ہیں، لیکن کوئی کوشش بارآور اور کوئی سعی مشکور ہوتی دکھائی نہیں دیتی۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ اکثریت نتائج میں اس ناکامی کو امریکہ اور اس کی سازشوں کے کھاتے میں ڈال کر یا دوسرے مخالفین کے سر منڈھ کر خود بری الذمہ ہو جاتی ہے۔ اخلاق اس حد تک بگڑ گئے ہیں کہ ہر شخص خود کو ''مصلح'' اور مخالف کو ''مفسد'' سمجھتا ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو دوسروں کو الزام دینے کے بجائے اپنے گریبان میں جھانکنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسے لوگ یقیناً آٹے میں نمک کے برابر ہوں گے جو حالات کا صحیح اور حقیقت پسندانہ تجزیہ کرتے ہوں، جو یہ سمجھتے ہوں کہ نتائج میں ناکامی کی ایک اہم ترین داخلی وجہ ایک طبقے، فرقے اور مسلک میں جماعت بندی، گروپ بندی اور پارٹی بازی یا ''تفریق'' ہے۔ کوئی فرقہ امت کے مجموعی دھارے سے الگ ہوتا ہے اور کچھ ہی عرصے بعد کئی ٹکڑیوں میں بٹ جاتا ہے۔

یہ چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں اور جماعتیں نکبت اور ادبار سے نکلنے کی بساط بھر کوشش کرتی ہیں، مگر ''تفریق'' ان کی کوششوں پر مٹی ڈال دیتی ہے، کیونکہ ہر ایک جماعت دوسری جماعت کی کوششوں کو سبوتاژ کر دیتی ہے۔ ہر ایک کی سمت علیحدہ اور فکر جدا ہوتی ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ جس نے بھی ڈیڑھ اینٹ کی اپنی الگ مسجد بنا رکھی ہے، خود کو ملت کا خیر خواہ سمجھتا ہے اور دوسرے فریق کو ملت کا بدخواہ گردانتا ہے۔ زبان سے گو نہ کہے، مگر اس کا عمل یہ چغلی کھاتا ہے کہ جو کام وہ کر رہا ہے، وہی کام ملت کے لیے سب سے اہم اور سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اس لیے اصل کام بس اسی کا ہے۔ اڑھائی ٹوٹے کر ایک شخص اپنی جماعت بنا لیتا ہے اور خود کو ''الجماعۃ'' کا مصداق، امت کا سوادِ اعظم اور ما انا

علیہ و اصحابی کا سچا پیروکار سمجھے لگتا ہے۔ ہر میدان میں تفریق نے ملت کی قوتوں کو منتشر اور تتر بتر کر دیا ہے۔ میری نظر میں تفریق، فرقہ واریت سے بھی بڑھ کر ملت کے لیے سم قاتل ہے۔ اس سے وہی نقصان ہو رہا ہے جو سیاسی میدان میں مرکزیت یعنی خلافت کے خاتمے کی وجہ سے ہوا۔

جمہوریت کے بجائے خلافت کا تصور دے کر اسلام نے تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک لڑی اور ایک وحدت میں پرو دیا۔ پوری دنیا کے مسلمان ایک قوم قرار پائے۔ خلافت کے حوالے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی تاکیدی احکام ارشاد فرمائے۔ یہاں تک بھی فرمایا کہ ایک کی موجودگی میں دوسرا داعئ خلافت ہو تو اسے قتل کر دو۔ آپ کے اس مبارک ارشاد کے علی الرغم امت کو جلد ہی دو خلیفوں کی اطاعت کا طوق اپنے گلے میں ڈالنا پڑا۔ وجوہات کچھ بھی ہوں، بہر حال جس چیز کا سد باب حضورؐ نے اس ارشاد میں کیا تھا یعنی مرکزیت ختم نہ ہو، امت اس پر عمل پیرا نہ ہو سکی۔ شاید اسی ارشاد کی خلاف ورزی کا نتیجہ تھا کہ خلافت تو خلافت، اندلس سے مسلمانوں ہی کا بیج ختم ہو گیا۔

خلافت مسلمانوں کا ایک مرکز تھی، دینی بھی سیاسی بھی۔ اس سے وابستگی عبادت تھی۔ رفتہ رفتہ ایک خاص وجہ سے یہ مرکز کمزور ہونا شروع ہوا۔ یہ وجہ وہی تھی جو ہمارے زوال و ادبار کی اصل اور جڑ ہے۔ مرکزی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر کئی علاقوں میں مختلف چھوٹی بڑی خود مختار امارتیں اور بادشاہتیں قائم ہو گئیں۔ اپنی تمام تر خود مختاری کے باوجود یہ امرا اس لحاظ سے دربارِ خلافت کے ماتحت ہی تھے کہ اپنی حکومت کو قانونی بنانے کے لیے دربارِ خلافت سے ان کا سند جواز حاصل کرنا ضروری تھا۔ گو اس وقت بھی مسلمان مختلف خطوں اور ملکوں میں تقسیم تھے، لیکن ملکی وطنی عصبیت نہیں تھی۔ ملک تھے، سرحدیں تھیں، اس حوالے سے شناخت بھی تھی، مگر قانون تقریباً یکساں تھا۔ نیشنلٹی اور شہریت کسی خاص ملک اور علاقے تک محدود نہیں تھی۔ ہر مسلمان ہر خطے میں یکساں شہری حقوق کا حقدار سمجھا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ عہدوں اور مناصب کی تجویز میں بھی یہ جغرافیائی اختلاف حائل نہ تھا۔ کوئی شخص خواہ کسی علاقے سے تعلق رکھتا ہوں، کسی بھی حکومت کے زیر سایہ ذمہ داری حاصل کر سکتا تھا، بشرطیکہ اس کا اہل ہوتا۔ یہود نصاریٰ نے سازشیں کر کے اور کچھ ناعاقبت اندیش مسلمانوں نے اس مقصد میں ان کا آلۂ کار بن کر اس مرکزیت کو ختم کر دیا۔ یہ لڑی ٹوٹتے ہی مسلمانوں کی وہ سیاسی وحدت ختم ہو گئی جس نے انھیں ایک قوم بنا رکھا تھا۔

''تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم ہیں''، مذہبی حمیت کے جذبات سے لبریز یہ ایک کھوکھلی بات ہے جو کبھی کبھی محراب و منبر سے سنائی دیا کرتی ہے یا ایک سیاسی نعرہ ہے جس کے ذریعے عوام کے دینی جذبات سے کھیلا جاتا ہے جو ابھی تک یہ سمجھتے ہیں کہ قوم ملک و وطن سے نہیں بلکہ دین و مذہب سے بنتی ہے، جبکہ تلخ حقیقت یہ ہے کہ جدید قومیت کی تشکیل میں دین و مذہب کا بنیادی عنصر عملاً ختم کر دیا گیا ہے اور اس کی جگہ ملک و وطن نے لے لی ہے۔ مولانا حسین احمد مدنی کے ایک بیان کی غلط رپورٹنگ پر طوفان اٹھا دینے والے مصور پاکستان حضرت علامہ اقبالؒ کو شاید علم نہیں تھا کہ جدید نظریۂ قومیت کو بتمام وکمال قبول کرنے والی کھیپ میں وہ لوگ بھی شامل ہوں گے جو ان کے خوشہ چین اور ان کے خواب میں تعبیر کا رنگ بھرنے والے ہیں اور ستم بالائے ستم یہ ہوگا کہ خود ان ہی کے کلام سے استشہاد کرتے ہوئے اسے صحیح و درست قرار دیا جائے گا اور شاید وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ ۱۹۳۰ء میں انہوں نے جو خواب دیکھا ہے، اس کی تعبیر

عنقریب اسی نظریے کو بنیادی فراہم کرنے والی ہے جس کی تردید کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا تھا:

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

اور یہ کہ:

اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
ملت کا جو پیراہن ہے وہ اس کا کفن ہے

اپنی کئی داخلی کمزوریوں کے باوجود خلافت نے اس طرح تمام دنیا کے مسلمانوں کو اپنے سایے میں لے رکھا تھا جیسے مرغی اپنے بچوں کو پروں کے نیچے چھپا لیتی ہے۔ اب مسلمان تسبیح کے بکھرے ہوئے دانے ہیں۔ سیاسی میدان میں ان کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں اور جماعتیں ہیں۔ یہ ٹکڑیاں اور جماعتیں ملک کہلاتی ہیں۔ ڈیڑھ ارب کے لگ بھگ مسلمانوں کے ستاون ٹکڑے جو آزادی اور خودمختاری کے کھلونے سے کھیل رہے ہیں۔ حالات سازگار اور ہوا موافق ہو تو ہر ٹکڑا اسی طرح مزید کئی ٹکڑوں میں بٹنے کے لیے تیار ہے جیسے ملت فرقوں میں بٹتی ہے اور فرقے مزید کئی ٹکڑیوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ فرقہ وارانہ تقسیم نے مسلمانوں کو وہ نقصان نہیں پہنچایا جو سیاسی اختلافات اور تفریق سے ہوا اور ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کی طاقت تقسیم ہو چکی ہے۔ اپنا ملک، اپنا وطن ان کی شناخت اور پہچان بن گیا ہے۔ ملکی عصبیت دلوں میں راسخ ہو چکی ہے۔ ملکی مفاد، ملی مفاد سے مقدم ہو چکا ہے۔ ہر ملک اپنے جغرافیائی اور مقامی حالات کے مطابق اپنی پالیسیاں بناتا ہے تاکہ اسے تحفظ و ترقی حاصل ہو، چاہے ان کے نتیجے میں دوسرے مسلمان ملکوں کا شیرازہ بکھر جائے۔ ہندوستان اور وہاں کے مسلمانوں کی پالیسی پاکستان کے لیے نقصان دہ ہے تو پاکستان کی ہندوستان، بنگلہ دیش اور افغانستان کے لیے۔ یہی ملکی اور وطن عصبیت تھی جس کے پیش نظر خونخوار ڈکٹیٹر پرویز مشرف نے ''سب سے پہلے پاکستان'' کا نعرہ لگا کر افغانستان کے مسلمانوں کی پشت میں خنجر گھونپا۔ یہ عصبیت طبیعتوں میں اتنی زیادہ رچ بس چکی ہے کہ مولانا صاحب بھی یوں دعا فرماتے ہیں ''اے اللہ! عالم اسلام کی عموماً اور ملک پاکستان کی خصوصاً حفاظت فرما''۔

مرکزیت کے خاتمے اور ملکوں کی بندر بانٹ نے مسلمانوں کا شیرازہ بکھیر دیا۔ مثال کے طور پر برصغیر پاک و ہند میں ستر کروڑ ہندو ایک جگہ جمع ہو گئے اور لگ بھگ اتنے ہی مسلمان چار حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ہر حصے کے تقاضے اور مفادات دوسرے سے جدا اور الگ۔ اگر اتنا ہوتا، تب بھی بہت غنیمت تھا کہ حالات کے جبر نے گو بھائیوں کو جدا کر دیا ہے، مگر ان کے دل ایک دوسرے کے لیے دھڑکتے اور ملاپ و وصال کے لیے تڑپتے ہیں۔ بات اس سے کہیں آگے بڑھ گئی۔ تقسیم کے ساتھ ہی ملکی اور لسانی عصبیتوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا۔ پاکستانی، ایرانی، ترکی، مصری، عربی اور عجمی عصبیتوں کے ساتھ ہی پنجابی، سندھی، بلوچی، مہاجر، مقامی، پختون، فارسی بان وغیرہ عصبیتوں نے بھی جنم لینا شروع کیا۔ ایک شناخت ''مسلمان'' چھوڑ کر جب جغرافیائی، مقامی اور لسانی شناخت پر اصرار کیا گیا تو پے در پے عصبیتوں کا دروازہ کھل گیا۔ یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ خلافت ختم کرنے کے لیے انگریزوں نے پہلے عرب نیشنل ازم کی پری تخلیق کی

جس کے لازمی نتیجے میں تُرک عصبیت نے جنم لیا۔عرب دشمنی اسلام دشمنی میں ڈھل گئی اور ترکی سے خلافت کے ساتھ ساتھ شعائر دین یہاں تک کہ عربی رسم الخط کو بھی دیس نکالا مل گیا۔آج ملکی وطنی اور لسانی عصبیتوں میں گھرے ہوئے مسلمان ممالک اور ان میں بسنے والے مسلمان ترقی اور عروج کے لیے اس شخص کی مانند غوطے لگا رہے ہیں جسے چار اندام سے جکڑ کر سمندر میں ڈال دیا گیا ہو۔غلبے اور عروج کے راستے ان پر کھل بھی کیسے سکتے ہیں جبکہ ان کی فکر منتشر اور سوچ متفرق ہے۔ان کے رستے جدا اور سمتیں علیحدہ ہیں۔وطنی عصبیتیں اور ملکی مفادات سب سے پہلے کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے۔قرآن یہودیوں کی بابت بیان کرتا ہے: تَحْسَبُهُمْ جَمِيعاً وَقُلُوبُهُمْ شَتَّى ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُونَ (الحشر ۵۹:۱۴) ورمسلمانوں کے صرف دِل ہی متفرق نہیں، ظاہر بھی بکھرا ہوا ہے۔

مذہبی فرقہ واریت یقیناً ایک المیہ اور ہمارا کمزور پہلو ہے، لیکن اسلامی سطوت وشوکت توڑنے میں سیاسی فرقہ واریت یا تفریق کا کردار سب سے اہم ہے۔ مذہبی فرقہ واریت کی بنیاد پر سر پھٹول ہو جاتی ہے، لوگ باہم دست وگریباں ہو جاتے ہیں، مگر سیاسی مقاصد میں اختلاف سے ایسی جنگوں کی نوبت آتی ہے کہ ہزاروں لاکھوں آدمی اس کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ان اختلافات نے سلطنتوں کی سلطنتیں مٹا دیں۔اپنی تاریخ اٹھا کر دیکھو، فرقہ واریت کی بنیاد پر جنگ کے اکا دکا واقعے ملیں گے، لیکن سیاسی فرقہ واریت پر مبنی جنگ وجدل کا ایک طویل سلسلہ نظر آئے گا۔

بات سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کا مختصر طور پر جاننا ہمارے لیے ضروری ہے:

(1) فرقہ کسے کہتے ہیں؟

(2) فرقہ بندی اور اس کے اسباب کیا ہیں؟

(3) فرقہ واریت اور اس کے اسباب کیا ہیں؟

(4) تفریق اور اس کی وجوہ علل کیا ہیں؟

(5) افتراق وتفریق کے نقصانات ومضمرات کیا ہیں؟

(6) اصل کام کیا ہے اور کیسے کرنا ہے؟

فرقے کی بنیاد سے واقفیت کے بعد ہی ہم فرقہ واریت سے آگاہ ہو سکیں گے۔اتنا ہی نہیں، اسی کے ساتھ وہ غلط فہمی بھی زائل ہو جائے گی جو بہت سے لوگوں کے ذہن میں پائی جاتی ہے اور جس کی وجہ سے وہ امت کے ان طبقات کو بھی فرقہ شمار کرتے ہیں جو کہ اصلاً فرقہ نہیں یعنی حنفی مالکی شافعی وغیرہ۔

فرقہ بندی، اصل اور بنیاد سے فی الجملہ علیحدگی ہے۔ بنیاد بالکل ہی علیحدہ ہو جائے تو فرقہ، فرقہ نہیں رہتا، کفر بن جاتا ہے۔فرقہ نام ہے ایسی جماعت کا جو گمراہ ہو، مگر کافر نہ ہو۔ایک ہی بنیاد یا اس بنیاد کے احاطے میں جو عمارات بھی تعمیر ہوں گی، وہ ایک ہی عمارت، کوٹھی، مکان یا قلعہ شمار کی جائیں گی۔ ہر اس عمارت کو الگ اور مستقل شمار کیا جاتا ہے جس کی بنیاد الگ ہو۔اصول وعقائد ہماری دینی بنیاد ہیں۔ جو گروہ اصول وعقائد میں اختلاف کر کے اپنے اعتقادات کی نئی عمارت بنائے گا، وہ ایک فرقہ شمار کیا جائے گا۔اس کے مقابلے میں جو اصل اور بنیاد سے جدا نہیں ہوا، وہ تقابل وتمایز کی بنا پر فرقہ کہا جاتا ہے، ورنہ وہ فرقہ نہیں۔

اس سے واضح ہوا کہ فرقہ اصول وعقائد میں اختلاف کرنے سے بنتا ہے نہ کہ اختلاف اعمال سے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ فروعی اعمال میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنالینا قابل مذمت ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کا نام میں نے تفریق رکھا ہے، اسی نے ہماری قومی وملی یک جہتی کو پارہ پارہ کر دیا ہے۔ یاد رکھیں کہ جو فرقہ اصل سے جتنا زیادہ اختلاف کرے گا، وہ اتنا ہی اس سے دور ہوگا۔ مثلاً معتزلہ، قدریہ، جبریہ وغیرہ اصل سے اختلاف کر کے ایک مستقل فرقے کی صورت میں اہل حق کے سامنے آئے، مگر ان کا اختلاف ایسا نہ تھا کہ انہیں کافر قرار دے دیا جاتا، اس لیے بہر حال وہ مسلمان ہیں گو کہ ان کے گمراہ ہونے میں کوئی شک نہیں۔ ان کے مقابلے میں مرزا غلام احمد قادیانی اور محمد علی باب وغیرہ نے اصل سے ایسا اختلاف کیا کہ دائرہ اسلام سے ہی باہر ہو گئے، لہٰذا انہیں ایک مسلمان فرقہ کہنا درست نہیں، گو کہ اپنا مرکز اطاعت جدا کر لینے کے بعد بھی وہ خود کو مسلمانوں میں داخل رکھنے کے لیے بے تاب ہیں۔

جس طرح اسلام کے کچھ ایسے اصول ہیں جن سے اختلاف دائرۂ اسلام ہی سے نکال باہر کرتا ہے اور کچھ ایسے جن سے اختلاف گمراہی کا سبب تو ہوتا ہے، مگر کفر کا باعث نہیں، اسی طرح ہر فرقے کے کچھ ایسے اصول ہوتے ہیں جن کی بنیاد پر اس کا قیام ہوتا ہے اور ان میں اختلاف کرنا فرد کو اس فرقے کی حد سے ہی خارج کر دیتا ہے، اور کچھ نظریات ایسے ہوتے ہیں جو اس کے الگ تشخص کو پروان چڑھاتے ہیں جن میں اختلاف سے تفریق تو ہو جاتی ہے، مگر اختلاف کرنے والا اس فرقے کی حد سے خارج نہیں ہوتا۔ جو جماعت اصول وفروع میں آج تک جادۂ حق سے منحرف نہیں ہوئی اور پہلے کی طرح برابر چلی آ رہی ہے، وہ ہے اہل سنت والجماعت۔

ہبوط آدم کے بعد کئی قرن تک لوگ اسی راہ پر چلتے رہے جو آدم علیہ السلام کی وساطت سے انہیں ملی تھی۔ جب اختلاف پیدا ہوا تو نوح علیہ السلام کو نئے احکام دیے گئے، وہ دین نوح کہلایا۔ اسی طرح سلسلہ چلتا رہا۔ احکام آتے رہے اور نبی کے نام سے دین موسوم ہوتا رہا۔ اسی کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا کہ ''ہم گروہ انبیاء علاتی بھائی ہیں، ہمارا دین واحد اور شرائع مختلف ہیں۔'' اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایک مدت تک معاملہ راستی پر چلتا رہا۔ درمیان میں اختلاف ہوئے، مگر ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو کہ بنیاد سے علیحدگی پر مبنی ہو اور نہ ان کی بنیاد پر صحابہ نے تفریق ہی پیدا ہونے دی۔ حضرات صحابہ کرام کے اختلافات معروف ہیں۔ یہاں تک کہ امت میں وہ پہلا اختلاف رونما ہوا جو کہ بنیاد سے فی الجملہ علیحدگی پر مبنی تھا۔ اس کے بعد اسی طرح کے اختلافات بڑھتے گئے۔ جو گروہ اصل سے نہ کٹا اور بنیاد سے جڑا رہا، وہ ان اختلاف کرنے والوں کے مقابلے میں اہل سنت والجماعت کہلایا۔ اس سے کٹنے والے مختلف ناموں سے موسوم ہوئے، مثلاً شیعہ، خوارج، قدریہ، جبریہ، مرجئہ اور معتزلہ وغیرہ۔ اہل سنت والجماعت کی تعبیر چند احادیث سے لی گئی جن میں سے ایک ما انا علیہ و اصحابی بھی ہے۔

یہاں سے عقائد میں دو تقسیمیں پیدا ہوئیں۔ ایک، وہ عقائد جن کا ثبوت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے قطعی یقینی اور متواتر ہے، انہیں ضروریات دین کا نام دیا گیا۔ ان میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ دوم، وہ عقائد جن کا ثبوت اس درجہ قطعی نہیں، لہٰذا ان کا انکار گو کفر نہ ہو، ضلالت اور گمراہی بہر حال ہے۔ انہیں ضروریات اہل سنت کا نام دیا گیا۔ رہا یہ سوال کہ انہیں ضروریات اہل سنت کیوں کہتے ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان عقائد میں اہل سنت چونکہ

راستی پر رہے اور ان کے مقابل گروہوں نے ان عقائد میں حق سے انحراف کیا، اس لیے ان کی اور اہل سنت کی نسبت سے یہ ضروریات اہل سنت سے موسوم ہو گئے۔

چودہ سو سال کی اس طویل مسافت میں کئی فرقے پیدا ہوئے اور جلد یا بدیر یادگاروں میں تبدیل ہو گئے۔ آج کے ماحول میں بھی فرقے موجود ہیں اور بظاہر بہت زیادہ نظر آتے ہیں، مگر انہیں ان کی اصلوں کے تحت داخل کیا جائے تو معدودے چند رہ جاتے ہیں۔ مثلاً اہل تشیع کے فرقے، یہ حضرات پہلے اپنی اصل سے جدا ہوئے، پھر گروہ در گروہ کئی شاخوں میں بٹ گئے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ نے ان کی شاخیں ۲۷ تک شمار کی ہے۔ اگر چہ یہ شمار میں کافی ہیں، مگر یہ سب اپنی ایک ہی اصل شیعہ کے تحت جمع ہو جاتے ہیں۔ ان سب کا اصل الاصول تفضیل علی کرم اللہ وجہہ کا عقیدہ ہے۔ ان میں سے کچھ وہ ہیں جنہوں نے آپ کو حضرت عثمانؓ پر فضیلت دی، کچھ وہ ہیں جنہوں نے شیخین کریمین پر، کچھ نے اس کے ساتھ خلافت بلافصل کا قول بھی کیا، بعض نے معاذ اللہ چار کے سوا تمام صحابہ کے مرتد ہو جانے کا عقیدہ رکھا، کچھ نے اسی کے ساتھ تحریف قرآن کا عقیدہ اپنایا۔ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اور ظاہری اہل سنت ہی کی شاخیں ہیں، فرقے نہیں ہیں۔ حیاتی مماتی، دونوں کی ایک اصل ہے، دیوبندی ہونا۔ دیوبندی اور بریلوی، دونوں کی ایک اصل ہے، حنفی ہونا۔ اہل حدیث کی تمام جماعتیں ایک اصل، ترک تقلید پر اکٹھی ہیں۔ اسی اصل میں نیچری، مودودی اور غامدی بھی شامل ہیں۔ ترک تقلید اہل ظاہر کا مسلک ہے اور اہل ظاہر، اہل سنت میں داخل ہیں۔ مگر یاد رہے کہ بعض گروہ کسی اعتبار سے اہل سنت میں داخل ہوتے ہیں تو کسی دوسرے پہلو کی بنا پر اہل سنت سے خارج بھی ہو جاتے ہیں یا کر دیے جاتے ہیں۔ مثلاً بریلوی، دیوبندیوں کے نزدیک حنفی ہونے کے لحاظ سے اہل سنت میں داخل ہوتے ہیں تو اس کے کئی مسلمات کا انکار کرنے کی وجہ سے خارج بھی ہیں اور دیوبندی، بریلویوں کے ہاں اسلام سے ہی خارج ہیں۔ اہل حدیث ان دونوں کو سنی ماننے کے لیے تیار نہیں۔ بعض فرقے وہ ہیں جنہیں تغلیباً اسلامی فرقوں میں شامل کیا جاتا ہے، درحقیقت وہ اس سے خارج ہیں۔

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ فرقہ سے مراد وہ جماعت ہے جو ضروریات اہل سنت میں اختلاف کرے۔ اسی کو دوسرے معنوں میں کہا جاتا ہے کہ جو اہل سنت والجماعت سے کٹتا ہے، وہ اگر چہ مسلمان ہے، مگر گمراہ ہے۔

فرقہ کے بعد دوسری اہم چیز جس کا ہمارے دور میں بہت چرچا ہے، فرقہ واریت ہے۔ یہ لفظ کافی بدنام ہو چکا ہے اور اس کی حقیقت جانے بغیر بالخصوص علما کو بدنام کرنے کے لیے بہت سے لوگ یہ لفظ بے محل استعمال کرتے ہیں، یہاں تک کہ اپنے موقف کی صحت اور مخالف کی تغلیط پر کوئی مدلل علمی گفتگو کرے تو ایسی گفتگو کو بھی فرقہ واریت اور قابل مذمت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ اپنے موقف کو ثابت کرنا اور دلائل سے دوسرے کی غلطی واضح کرنا، ہر ایک کا حق ہے۔ یہ فرقہ واریت نہیں، وہ تو اس سے جدا ایک اور ہی شے ہے۔

فرقہ واریت اگر آپ غور کریں تو معلوم ہوگا کہ اظہارِ حق یا ابطال باطل کا نام نہیں بلکہ مخالف فرقے کے حق میں عدل وانصاف اور حدود وتہذیب کے دائرے سے باہر نکل جانے کا نام ہے۔ باہمی جدل ومنازعت اور دوسرے کو زک پہنچانے کی کوشش فرقہ واریت ہے۔ دامنِ عدل وانصاف چھوڑ دینے کا مطلب ہے مخالف سے تعصب برتنا، اس کے

کلام کو غلط معنی پر محمول کرنا، وہ عقائد اس کے سر منڈھنا جو اس کے نہیں، اس پر الزامات عائد کرنا۔ حدود سے باہر نکلنے کا مطلب ہے اختلاف میں غلو سے کام لینا، اسے اپنے مقام پر نہ رکھنا اور معمولی اختلاف کو بھی کفر اسلام کا اختلاف بنا دینا۔ حلقہ تہذیب سے باہر نکلنے کا مطلب ہے مخالف کو گالیاں دینا، طعن وتشنیع اور تضحیک واستہزا سے کام لینا، نام بگاڑنا، غیر سنجیدہ اور غیر علمی انداز اختیار کرنا، بڑھکیں لگانا، لوگوں کے جذبات ابھارنا کہ وہ نہ صرف اس سے نفرت ہی کریں بلکہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جائیں۔ علمی اختلاف کو بازاری اختلاف بنا دینا، اس کے اکابر اور بزرگوں پر سب وشتم کرنا۔ فرقہ واریت کی آگ نفسیاتی پیچیدگی اور اخلاقی کمزوری سے بھڑکتی ہے۔ اس کی جڑ سیاست کا پانی اور سازش کی کھاد ملنے سے خوب برگ وبار لاتی ہے۔

تیسری اہم چیز تفریق ہے جو کہ اپنے نتائج کے لحاظ سے بہت سنگین ہے، مگر لوگ اسے درخور اعتنا نہیں جانتے۔ فرقہ بندی اور فرقہ واریت کے بارے میں ایک جان کاری کے بعد تفریق کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہا۔ فکر، مذہب، عقیدہ، نظریہ اور مسلک کی یکسانی کے باوجود الگ الگ گروہوں، گروپوں، جماعتوں اور دھڑوں میں اس طرح تقسیم ہو جانا کہ ایک گروہ کا انتخاب دوسرے کی لغویت، حقارت اور تنفر ونقصان پر مبنی ہو، تفریق کہلاتا ہے۔ یاد رہے کہ تفریق صرف مذہبی نہیں ہوتی بلکہ فی زمانہ ہمارے ہر شعبے میں، وہ دینی ہو خواہ دنیاوی، تفریق در تفریق کا ایک سلسلہ موجود ہے۔ ایک ہی شعبے کے لوگ چھوٹے چھوٹے گروہوں اور جماعتوں میں منقسم ہیں جو دلوں میں ایک دوسرے کے لیے شدید کدورت اور نفرت رکھتے ہیں اور اسی کے ساتھ حق وراستی کو اپنی ذات میں منحصر کرتے ہیں۔ تاریخ اٹھا کر دیکھیے کہ کیسے سنی یا شیعہ آپس میں ایک دوسرے کو مرتے مارتے رہے، حنبلیوں اور شافعیوں نے کیسے ایک دوسرے کے گلے کاٹے۔

پھر جیسے مذہبی فرقہ بندی سے زیادہ سیاسی فرقہ بندی نے امت کو نقصان دیا، اسی طرح مذہبی تفریق سے زیادہ سیاسی تفریق نے امت کا نقصان کیا اور کر رہی ہے۔ جو نسبت مذہبی افتراق وتفریق میں ہے، وہی نسبت سیاسی افتراق وتفریق میں بھی ہے اور نقصان اس کا زیادہ ہے۔ سیاسی افتراق کا مطلب ہے دو ایسے بالمقابل گروہ بن جانا جن کا نسب علیحدہ ہے، مثلاً بنوامیہ اور بنوعباس۔ یا نظریہ علیحدہ ہے، مثلاً مختار بن عبید ثقفی اور ابن زیاد۔ یا قوم علیحدہ ہے، مثلاً سلجوقی وعباسی اور ہندوستان میں خلجی، تغلق، غلاماں اور مغل۔ یا مذہب علیحدہ ہے، مثلاً مصر کے فاطمیین اور زنگی وایوبی یا آل بویہ وبنوعباس یا قاچاری وصفوری اور مغل۔ یا صرف حصول حکومت کا جذبہ ہے، مثلاً تیمور وبایزید یا بابر وخاندان غلاماں یا عرب وترک یا ترک خلافت پسند اور ترک جدت پسند۔ تفریق کا مطلب ہے ہم نسب، ہم قوم، ہم مذہب یا ہم فکر ہونے کے باوجود باہم مخالفت کرنا، مثلاً علویوں وعباسیوں کی چپقلش یا عباسیوں یا خاندان غزنوی کی باہم سر پھٹول یا آخری دور میں شاہان مغلیہ کی باہمی لڑائیاں یا جمعیت علماء ہند کی تفریق یا مسلم لیگ کی تفریق در تفریق یا جے یو آئی کی تفریق وغیرہ۔

اس تفصیل کی روشنی میں اگر ہم غور کریں گے تو تفریق، فرقوں سے زیادہ نظر آئے گی۔

پاکستان کی حد تک اگر جائزہ لیا جائے تو تفریق در تفریق کا ایک لمبا سلسلہ نظر آتا ہے۔ ہر ہر مسلک کی کئی کئی دینی جماعتیں، پھر ہر جماعت کے کئی کئی حصے اور ہر حصہ دوسرے سے الگ مستقل جماعت۔ کئی سیاسی جماعتیں، خواہ مذہبی

ہوں خواہ غیر مذہبی اور اکثر جماعتوں کے کئی کئی جائز و ناجائز بچے ایک دوسرے کے راستے میں روڑے اٹکاتے، دوسرے کو ملک دشمن اور غدار قرار دیتے اور اپنے لیے فری ہینڈ کے طالب نظر آتے ہیں۔ یہاں یہ بات ایک دفعہ پھر دہرا دوں کہ تفریق کا مطلب محض اختلاف رائے نہیں ہوتا، بلکہ اس کی بنیاد پر اس طرح جماعت بندی، جتھ بندی، گروہ بندی اور پارٹی بازی کرنا کہ کچھ لوگ اکٹھ کر کے اپنا الگ تشخص بنائیں، لوگوں کو دوسروں سے کاٹیں اور اپنی طرف بلائیں، تفریق کہلاتا ہے۔ اس طرح ہر جماعت دوسرے کی ٹانگ کھینچتی اور اسے نیچا دکھا کر خود جگہ بنانے کی فکر میں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان کسی ایک نکتے یا فکر پر اکٹھے نہیں ہوتے۔

ایک دوسرے رخ سے اس کا مطالعہ کریں تو بھی صورت حال خاصی مایوس کن اور دگرگوں نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ باہمی اتحاد کے لیے کوشاں ہیں، وہ خود کئی ٹکڑوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ کسی ایک مسلک کے لوگ جو اس کی تفریق پاٹنے کے لیے کوشش کرتے ہیں، ان میں سے بھی ہر ایک کی سمت فکر و نظر عام طور پر جدا جدا ہوتی ہے۔ ویسے کہنے کو تو ہر ایک یہی کہتا ہے کہ اتحاد ہونا چاہیے۔ ان مدعیان اتحاد و اتفاق کی کوششیں باہم مربوط نہیں۔ صحیح یہ ہے کہ ابھی تک وہ یہی طے نہیں کر سکے کہ اتحاد کا لائحہ عمل کیا ہو اور اس کے نکات کیا ہوں۔

سیاسی جماعتوں کی اکثریت پہلے نمبر پر ذاتی مفاد کی سیاست کرتی ہے اور ثانوی طور پر ملکی و قومی مفاد کو پیش نظر رکھا جاتا ہے وبس۔ بین الاقوامی طور پر مسلمانوں کو ایک لڑی میں پرونا ان کا مطمح نظر ہی نہیں۔ چند ایک افراد یا معمولی طائفے ہیں جو اس طرح کی سوچ رکھتے اور اس کے لیے کوشش بھی کرتے ہیں، مگر افسوس کہ وہ مسلک سے بالاتر ہو کر نہیں سوچ سکتے، کیونکہ مسلکی تشخص کو نمایاں کرنا بھی ایک نفسیاتی مجبوری ہوتی ہے، یہاں تک کہ اتحاد امت یا اشاعت وحفاظت اسلام وغیرہ کے لیے ان کی یا ان کے ہم مسلک افراد و جماعتوں کی جو کوششیں ہوتی ہیں، وہ بھی بالآخر مسلکی فخر کا روپ دھار لیتی ہیں اور جو بے چارہ اس تشخص سے بالاتر ہو کر کام کرے، وہ اپنے اور پرائے دونوں کی نظروں میں مطعون ہو جاتا ہے۔ پھر یہود و نصاریٰ کی سازشوں کے تحت جنم لینے والی ملکی تقسیم بھی ان کے کام کو محدود کر دیتی ہے۔ وہ ملکی سیاست کے بھنور اور ملکی حالات کے گرداب میں مبتلا رہتے ہیں اور ان مصنوعی سرحدوں کے احاطے سے باہر نہیں نکل سکتے۔ وجہ یہی ہے کہ ملکی مفاد مقدم رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ یہ تو ایک بالکل فطری بات ہے کہ جب بھی آپ ایک سے دوسری جماعت یا فورم تشکیل کریں گے جن کی جنس ایک ہی ہو تو کسی بھی وقت ان دونوں کے مفاد میں ٹکراؤ پیدا ہو جائے گا۔ یعنی ہو سکتا ہے کہ ایسے کسی فورم کی تشکیل کے بعد ایسا کوئی معاملہ سامنے آ جائے جس پر عمل درآمد اگرچہ عالمی طور پر مسلمانوں کے لیے فائدہ مند ہو، مگر کسی ایک ملک کے نقصان کا سبب ہو تو کون اس کو قبول کرے گا؟ ملکی قوانین اور مفادات سے بالاتر ہو کر کام کرنا چاہیں تو ریاست سے ٹکر لینا پڑتی ہے۔ ان پر کئی طرح کی پابندیاں عائد ہو جاتی ہیں اور گاہے ریاست کے باغی بھی قرار دے دیے جاتے ہیں۔ ہزار اختلافات کے باوجود اسامہ کا اصل جرم یہی تھا کہ اس نے عرب ممالک سے امریکی اڈے اٹھانے کی بات کی تھی۔ مآل کار اس کی شہریت ہی منسوخ کر دی گئی۔ پوری مسلم دنیا میں ریاستوں اور ملکوں کا انتظام جن لوگوں کے ہاتھوں میں ہے، نرم سے نرم الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ عیسائیوں اور یہودیوں کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہونے کی طاقت نہیں رکھتے۔

فرقہ،فرقہ واریت اورتفریق کے بارے میں جان کاری کے بعدان کے اسباب کا جاننا بھی ضروری ہے تا کہ بقدر استطاعت ان کا تدارک کیا جا سکے۔ اسلام نے ہمیں اعتصام بحبل اللہ کا حکم دیا۔حبل کی ایک تفسیر الطاعۃ والجماعۃ سے بھی کی گئی ہے۔الطاعۃ یعنی خروج اور بغاوت نہ کرنا اورالجماعۃ یعنی جماعت میں رہنا،تفرقہ نہ کرنا۔خلاف اطاعت سے سیاسی تفریق وانتشار نے جنم لیااور خلاف جماعت سے مذہبی فرقہ بندی پیدا ہوئی۔فرقہ بندی،فرقہ واریت اورتفریق، ان تینوں کے اسباب تقریباً ایک جیسے ہیں جو کہ خلاف اطاعت و جماعت میں اجمالاً مذکور ہیں،مگران کے تفصیلی عوامل کو جمع کرنا خاصا دشوار اور محنت طلب کام ہے۔ یہ مختصر تحریر ان تفصیلات کی متحمل بھی نہیں ہوسکتی۔سرسری تلاش وفکر سے جو باتیں برقِ بیتاب کی طرح ذہن کی فضا میں مچل رہی ہیں، انھی کو بیان کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔اکثر تو اسباب یکساں ہی ہیں،مگرکہیں کوئی منفرد ہے تواس کا ذکر بھی اسی ذیل میں کیا جائے گا۔

۱) **عقل پر بے حد اعتماد:** یہ فرقہ بندی کی ایک اہم وجہ ہے۔مسلمان کا کام یہ ہے کہ شریعت کے سامنے منقار عقل کو زیر پر رکھے۔پیش شریعت عقل کا سپر انداز ہوکر رہنااس کی خوبی ہے،مگرکئی فرقے ایسے ہیں جن کے بانیوں نے عقل پر بے جا اعتماد کیا۔نصوصِ قرآن وسنت کے سامنے صحابہ واسلاف کی مانند سرتسلیم خم کرنے کی بجائے عقلی گھوڑے دوڑائے اورعقل نارسا نے جس طرف ان کی راہ نمائی کی، جمہورامت کا راستہ چھوڑ کر اسی طرف چل دیے۔یوں ایک نیا فرقہ وجود میں آ گیا۔گویا قرآن وسنت کے بجائے انہوں نے عقل کو معیار بنایا اوراس کے ذریعے سے صحیح وسقیم کو جانچتے اورحسن وقبح کو پرکھتے رہے۔خودکوعقل کل سمجھنے سے ہی تفریق بھی پیدا ہوتی ہے۔

۲) **خودرائی:** یہ بھی عقل پر اعتماد ہی کی ایک خاص صورت ہے۔خودرائی میں گرفتار لوگوں نے باب عقائد میں اسلاف کے فہم دین کو معتبر نہ سمجھا یا اس کا اعتبار کرتے ہوئے مزید تحقیق وجستجو سے کام لیا تو نتیجہ فہم سلف یا ظاہر قرآن وسنت کے خلاف نکلا۔بجائے اس کے کہ وہ نتائج پر نظر ثانی کرتے ،انہوں نے اپنی رائے کو معتبر سمجھ کر اسلاف کی تحقیق ونتیجے کورد کر دیا۔یہی خودرائی پھرکسی نئے فرقے کے قیام کا سبب بن گئی۔اس مرض کا شکار افراد تفریق کا ذریعہ بھی بنتے ہیں،اگران کی رائے نہیں مانی جاتی تو اجتماعی یا جماعتی رائے کے سامنے سر جھکانے کے بجائے اپنی مسجد الگ بنا لیتے ہیں۔خودرائی کا مریض اپنی ہی رائے کودرست اورحق بجانب سمجھتا ہے جس کا تقاضا مخالف رائے کی بے وقعتی اورتردید ہے۔اب دونوں طرف سے ایک دوسرے کی تردید کا سلسلہ جاری ہو جاتا ہے۔ان میں سے ایک یقیناً حق پر ہوتا ہے، کیونکہ بابِ عقائد میں حق ایک ہی ہوتا ہے۔ایک اپنی رائے کی ہٹ کرتا ہے اور دوسرا احقاق حق کا فریضہ ادا کرتا ہے۔ یہ بات بھی فرقہ واریت کا سبب بن جاتی ہے۔

۳) **علمی غرور:** کوئی مسئلہ،کوئی عقیدہ سمجھنے میں کسی سے خطا ہوئی مگر حق واضح ہوجانے کے باوجود علمی غرور کی وجہ سے خطا پر اڑا رہا اوراسی خطا کو برحق ثابت کرنے کے لیے پورا زورصرف کر دیا۔ یہ خطا اس کے پیروکاروں کے لیے عقیدہ بن گئی اور ایک نیا فرقہ سامنے آ گیا۔علمی پندار میں مبتلا افراد اپنے سوا کسی کی بات کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے اور تفریق اورفرقہ واریت کا سبب بنتے ہیں۔

۴) **حب مال وجاہ:** کچھ ایسے لوگ بھی پیدا ہوئے جنھوں نے مال وجاہ کی طلب میں عمداً راہِ حق سے انحراف

کیا۔عموماً یہ لوگ امرا کے حاشیہ نشین اور سلاطین کے خوشہ چین ہوتے۔ مال ومنصب کے حصول وبقا کے لیے انہوں نے کبھی ان کی غلط باتوں کو شریعت کی سند بخشی اور کبھی از خود فتوے دیے۔ بعدازاں جادۂ حق سے یہ انحراف کسی فرقے کا پیش خیمہ یا تفریق کا سبب بن گیا۔محبِّ مال اور جاہ پسند آدمی ہمیشہ فرقہ واریت کی بھٹی دہکانے میں لگا رہتا ہے، کیونکہ یہ آگ جتنی زیادہ بھڑکتی ہے، اس کے مال وجاہ میں اتنا ہی اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ ایسا آدمی اس بات کو برداشت نہیں کرتا کہ کسی معاملے میں اس کو پیچھے رکھا جائے۔ جب تک اس کی نمبر ایک حیثیت برقرار رہتی ہے، وہ ساتھ چلتا رہتا ہے اور جہاں کہیں اس میں فرق آتا ہے، وہیں وہ اپنا راستہ الگ کر لیتا ہے۔محبِّ مال وجاہ ان دونوں کی محبت میں حق کو ٹھکراتا اور باطل کو بڑھاتا ہے۔ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اگر میں نے حق قبول کیا یا مخالف کو نہ روکا تو یہ چیزیں مجھ سے چھن جائیں گی۔ پیٹ اور دماغ کی خاطر وہ حق اور اہل حق کی مخالفت شروع کرتا ہے اور اس میں آخری حد تک جانے سے بھی گریز نہیں کرتا تاکہ اس کے دائرۂ اختیار وحکومت سے ان کا بیج تک نکل جائے۔ضد اور استقامت کا تصادم فرقہ واریت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

۵) **سوءِ فہم:** کچھ لوگ ایسے تھے جن کے ظرف تنگ اور عقل گینڈے کی کھال جیسی موٹی تھی۔ ان کا فہم تحجیر سے مغلوب اور خیال پر جنون کا اثر تھا۔فہم کی خرابی کی وجہ سے بڑے خلوص کے ساتھ انہوں نے کبھی غلط کو صحیح سمجھ لیا اور کبھی صحیح کو غلط استعمال کیا۔ ان کے فکر وفہم میں خرابی کی روش نے کسی نئے فرقے کو جنم دیا۔ انہوں نے ہمیشہ پوست کو مغز سمجھا۔ کبھی تو انہوں نے مرغے کی ایک ٹانگ پکڑ کر ایک نص کی آڑ میں تمام نصوص کو رد کر دیا، کبھی ظاہر وباطن کی تفریق پیدا کی اور کبھی قید شریعت کو لغو قرار دے دیا۔ یہ کم فہمی عقائد میں ہوئی تو فرقہ پیدا ہوا اور دیگر معاملات میں ہوئی تو تفریق پیدا ہوئی۔ جن کے فہم میں کمزوری ہو، وہ مخالف کے کلام کا غلط مطلب لے لیتے ہیں۔ اس کی مراد کچھ ہوتی ہے اور یہ الگ مراد تخلیق کر لیتے ہیں۔ ایسے آدمی کو جب مناسب جگہ مل جائے جہاں سے وہ اپنی بات دوسروں کو پہنچا سکتا ہے، خواہ تقریر ہو خواہ تحریر تو پھر اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے۔تحریر وتقریر سے یہ دوسروں کے لیے دلوں میں نفرت انڈیلتا اور فرقہ واریت میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔فہم کی یہ خرابی ایک اور پہلو سے بھی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ لوگ عموماً ایک کی بات دوسرے کو جا لگاتے ہیں۔ سیاق وسباق سے کاٹ کر یا غلط مفہوم کا چولا پہنا کر ایک کی بات دوسرے تک پہنچائی جاتی ہے۔ کچھ شریر طبع لوگ شر پھیلانے کے لیے اور بعض خرابی فہم کی بنا پر خطاً ایسا کرتے ہیں۔ طرفہ یہ کہ یہ اپنے مسلکی رؤسا کے مقرب اور ان کے نزدیک ثقہ ہوتے ہیں، اس لیے بلا تامل ان کی بات تسلیم کر لی جاتی ہے، حالانکہ ثقاہت وعلوفہم میں تلازم نہیں۔ کانوں کے کچے زعما تحقیق کیے بغیر ان غلط اطلاعات کو لے اڑتے اور فرقہ واریت کی بھٹی دہکانا شروع کر دیتے ہیں۔

۶) **متشابہات کی پیروی:** قرآن وسنت میں اکثر تو محکمات ہیں، مگر کچھ متشابہات بھی ہیں۔ متشابہات سے وہ چیزیں مراد ہیں جن کی مراد عقلِ نارسا کی گرفت میں نہیں آ سکتی، اس لیے ان پر اسی طرح ایمان لانے کا تقاضا کیا گیا ہے جیسی کہ وہ ہیں۔ ان کی مراد کے درپے ہونا زیغ قلب اور فتنہ پروری کے سوا کچھ نہیں۔بعض فتنہ پسند طبائع نے آخری حد تک ان کی حقیقت پانے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں وہ جادۂ حق سے بھٹک گئے اور حقیقت کھوجتے ہوئے خود بھول بھلیاں میں کھو گئے۔

۷) **تحقیق پسندی:** خوگرِ تحقیق ہونا کوئی عیب کی بات نہیں، مگر نشترِ تحقیق سے جب اسلام کا جگر چاک کر کے خود رائی کی پیوند کاری کی جائے تو تضییع اوقات کے علاوہ افتراق کا عفریت جنم لیتا ہے۔ امت کا ایک متوارث فہم دین ہے جو اسلاف سے اس نے نسل در نسل حاصل کیا ہے۔ تحقیق پسند طبیعتوں کو یہ بات کھلتی ہے کہ اسے من وعن قبول کر لیا جائے اور بالخصوص کوئی بات ان کے عقلی فریم میں ٹھیک نہ بیٹھ سکے تو بس قیامت ہے۔ اپنے قصورِ فہم اور نقصِ تحقیق کا اعتراف کرنے کے بجائے اس کے درپے ہو جاتے ہیں کہ اسلاف سے جو کچھ ہمیں ملا ہے، اس میں کیڑے نکالے جائیں۔ ہر کیڑا ایک نیا فرقہ ہوتا ہے۔ ہمارے اس دور میں تحقیق وجستجو کی یہ ہوا بہت زیادہ چل رہی ہے۔ اسلاف اور ان کے علوم وتحقیق کے لیے متاثر کن اور قابل احترام الفاظ استعمال کر کے بڑے سائنٹفک انداز میں مسلمات امت کو رد کرتے ہوئے نئی ناقص تحقیق مارکیٹ میں لائی جاتی ہے اور غیر محسوس طریقے سے صراطِ مستقیم سے لوگوں کو بھٹکایا جاتا ہے۔ آہستہ آہستہ ایک الگ فرقہ بن جاتا ہے۔

۸) **سازش:** کئی فرقے سازشوں کی کوکھ سے نکلے۔ پہلے یہودی سازشوں نے سر اٹھایا، پھر مجوسیت وزردشتیت نے برگ وبار نکالے۔ ازاں بعد نصرانیت بھی ان کے قدم سے قدم ملا کر چلنے لگی۔ تاریخ اسلام میں پہلے تفرقے کی بنیاد ہی سازش پر رکھی گئی تھی۔ قدیم ایرانی سرزمین میں فتنوں کی خوب گرم بازاری رہی۔ ان میں سے کچھ تو ایسے تھے جنہوں نے کھلم کھلا زندقہ والحاد کی راہ اپنائی، کچھ نیچے دروں نیچے بروں کا مصداق رہے۔ بعض اہل حق کے قریب نظر آئے اور کچھ کفر کے قریب جا پہنچے۔ مسلمانوں کی وحدت توڑنے کے لیے ان اقوام نے جامع منصوبہ بندی کے ساتھ اپنے مہرے آگے بڑھائے جنہوں نے بابِ عقائد میں بالخصوص من مانے تصرفات کر کے لوگوں کا راستہ جمہورِ امت سے کاٹ دیا۔ یہ سازشی عناصر آج تک کام کر رہے ہیں۔

فرقہ واریت پیدا کرنے کے لیے بھی سازشوں کو کام میں لایا جاتا ہے۔ اسلامی تاریخ میں فرقہ بندی وفرقہ واریت ہر دو کے لیے سازشوں کا سراغ ملتا ہے۔ ہمارے زمانے میں ہشت پہلو سازشیں نہایت کثرت سے کی جاتی ہیں۔ ان کا تانا بانا اس طرح بنا جاتا ہے کہ اس کا شکار ہونے والا یہ محسوس ہی نہیں کر سکتا کہ وہ کسی سازش کا شکار ہوا ہے۔ اپنی جگہ وہ اپنے عمل کو دین کی بڑی خدمت سمجھتا ہے۔ سازشیں فرقہ بندی اور فرقہ واریت کا اہم عنصر ہیں۔ سازشی عناصر نے صرف فرقے ہی کھڑے نہیں کیے، بلکہ امت کو فرقہ واریت اور اس سے بھی زیادہ تفریق میں مبتلا رکھا۔ باطل پسند قوتوں نے اپنے اہم مذموم مقاصد اکثر وبیشتر سازشوں ہی کے ذریعے حاصل کیے۔ پھر فہم وفراست کی کمی، جذباتی پن، تعصب اور ایک پہلو کو سامنے رکھ کر باقی پہلوؤں سے غفلت کی نفسیات نے سازشوں کو پنپنے کے زیادہ مواقع فراہم کیے۔

عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ کسی سازش کا شکار ہو کر اس الاؤ میں مزید ایندھن ڈالنے والے سادہ لوح کسی سازش کے وجود سے بے خبر ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے صرف یہ پہلو ہوتا ہے کہ بالمقابل باطل کھڑا ہے جسے مٹانا اس وقت ہر فرض سے اہم فرض ہے۔ کبھی سازش کا ادراک کرنے کے باوجود بوجوہ پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ کبھی اس کا تانا بانا انتہائی چابک دستی سے بن کر ایسے حالات پیدا کر دیے جاتے ہیں کہ ان حالات میں ردعمل کا اظہار کرو، تب بھی اور نہ کرو، تب بھی نقصان ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہوتا ہے جہاں تفریق پیدا ہوتی ہے۔ ایک فریق ردعمل کا مظاہرہ ضروری

سمجھتا ہے اور دوسرا چاہتا ہے کہ مطلق پروا نہ کی جائے۔ ایک انہی حالات کو اصل سمجھ کر اس کے مطابق اس پر توجہ دیتا ہے اور دوسرا انہیں کسی دوسرے بڑے مسئلے کی فرع گردانتے ہوئے اس کے مطابق کارروائی کرتا ہے۔ یہاں دو فریقوں کے راستے الگ ہو جاتے ہیں۔ ہر آنے والے نکتے پر ان کا آپس میں فاصلہ بڑھتا رہتا ہے۔ اس خاص مسئلے میں ایک کے اندر سختی ہوتی ہے اور دوسرے کے اندر نرمی۔ ایک پر تشدد یا لاقانونیت کا راستہ اختیار کرتا ہے، دوسرا عدم تشدد یا قانونی چارہ جوئی کا۔

خیر، حالات کے اعتبار سے دیکھا جا سکتا ہے کہ ان حالات میں کون سا موزوں اور بحیثیت مجموعی مفید ہے، البتہ ہمارے یہاں یہ ذہن بن چکا ہے کہ اسلام اور اظہار حق کا نام لے کر جو شخص جتنا زیادہ لاقانونیت کا مظاہرہ کرے، غلو اور تشدد کو اختیار کرے، وہ اتنا بڑا مجاہد اور اسلام کا بطل جلیل ہے، چاہے اس کے نتیجے میں اپنی طاقت کو گنوا دیا جائے، لاشوں کے تحفے ملیں، فتنہ وفساد بڑھ جائے، دشمن چوکنا ہو جائے اور بدامنی پھیل جائے۔ اس کے برعکس جو شخص پر امن رہے، قانون کی حد میں رہ کر کام کرے، حد اعتدال سے باہر نہ نکلے، وہ بزدل اور گنہ گار ہے۔ یہ بالکل غلط ہے۔ اس تصور نے ہمیں بہت نقصان پہنچایا ہے۔ میرے خیال میں فی نفسہ لاقانونیت باعث ثواب ہے نہ قانون کی پاسداری، بلکہ یہ دونوں شریعت کے تابع ہیں اور اس کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً غیر مسلم مسلمانوں کے ملک پر قبضہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہے تو اس کے خلاف عسکری جدوجہد کرنا فرض ہے، طاقت کم ہے یا زیادہ۔ اگر اس کے ملک پر حملہ کرنا ہے تو پھر طاقت کی فراہمی ضروری ہے۔ اگر وہ قبضہ مکمل کر چکا ہے تو دو صورتیں ہیں۔ اگر طاقت ہے تو اس کے آئین وحکومت سے بغاوت جائز ہے۔ اگر طاقت نہیں اور وہ دین اسلام پر عمل کرنے کی اجازت دیتا ہے تو وہاں رہنا جائز ہے۔ اگر ایسا بھی نہیں تو ہجرت فرض ہے۔ اگر غیر مسلم ملک میں اس کی اجازت سے مقیم ہیں تو یہ ایک معاہدہ ہے جس کے تحت اس کا قانون توڑنا درست نہیں۔ مسلمان ملک کا قانون غیر اسلامی ہے اور اس میں تبدیلی کا آئینی راستہ موجود ہے تو اس کے مطابق اس کو بدلنے کی کوشش کرنا فرض ہے۔ اگر ایسا کوئی راستہ نہیں تو تبدیلی کی کوشش حصول قوت کے بعد لازم ہے اور عوام کو دین پر عمل کی اجازت ہے تو وہاں رہنا جائز ہے۔ مسلم ملک کا قانون اسلامی ہے تو اس کی پابندی کرنا ضروری ہے۔ ہاں، اگر کوئی شق غیر اسلامی ہو تو اس صورت میں یہ طے کرنا ہوگا کہ قانون شکنی کرنی ہے یا اس کی پاسداری۔ مگر افسوس کہ ایسے مراحل میں ان تمام باتوں کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ اس کے بجائے جذبات کو کام میں لایا جاتا ہے اور خفتہ جذبات کے اظہار کو احقاق حق کا خوبصورت نام دے دیا جاتا ہے۔

ہندوستان میں تقسیم سے پہلے انگریز حکمران تھے جن کا مشہور زمانہ اصول تھا ''لڑاؤ اور حکومت کرو''۔ اس اصول کو کام میں لاتے ہوئے انہوں نے سیاسی طور پر ہندوؤں، مرہٹوں اور سکھوں کو مسلمانوں سے، پھر مسلمانوں کو آپس میں ایک دوسرے سے لڑایا جس کے نتیجے میں ہندو، مرہٹے، سکھ اور مسلمان چار الگ الگ قوتوں میں تقسیم ہو گئے۔ اس تفریق کا اثر یہ ہوا کہ مسلمانوں کو چوکھی لڑائی لڑنی پڑی۔ ہندوؤں سے، مرہٹوں سے، انگریزوں سے اور اپنے مسلمان بھائیوں سے۔ پھر جو مسلمان ان کے بالمقابل تھے، سازشیں کر کے ان کے اندر سے بندے توڑے جیسا کہ سراج الدولہ، ٹیپو سلطان اور بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ہوا۔ یہ تو سیاسی تفریق تھی جو انگریزوں نے پیدا کی۔ خالص مذہبی میدان

میں بھی انہوں نے مسلمانوں کو کئی حصوں میں بانٹا۔ سید احمد شہید اوران کے رفقا تو ۱۸۳۱ء میں شہید ہو گئے، مگر ان کی تحریک جاری رہی۔ ان لوگوں نے انگریزوں کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔ عام مسلمانوں سے ان کا رشتہ کاٹنے کے لیے انگریزوں نے بعض علماء سوء کو ساتھ ملایا اوران کی وساطت سے انہیں وہابی مشہور کرا دیا۔ اسی طبقے نے آگے چل کر علماے دیوبند کی راہ میں روڑے اٹکانے کی کوشش کی اور ۵۰ سال محنت کر کے امت کو دیوبندی بریلوی فرقوں میں بانٹ دیا۔ اسی دور میں غیر مقلدین نے برگ وبار نکالے جو کہ انگریزوں کے پشتی بان رہے۔ قادیانیت کا پودا انگریزوں نے کاشت کیا۔

علماء دیوبند کی نمائندہ تنظیم جمعیت علماء ہند بھرپور طریقے سے انگریزوں کے خلاف غیر مسلح جدوجہد کر رہی تھی۔ شومئی قسمت کہ جب اتحاد کی سخت ضرورت تھی، اسی وقت یہ قوت دو حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ معلوم نہیں اس کے پس پردہ سازش کارفرما تھی یا حالات کی روشنی میں محض اختلاف رائے تھا جس نے علماء کی قوت تقسیم کر کے دو الگ الگ سمتوں میں لگا دی۔ ایک وقت تھا جب پنجاب میں بالخصوص احراریوں کا طوطی بول رہا تھا، یہاں تک کہ ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کا قضیہ تازہ ہوا۔ اس موقع پر بعض ناعاقبت اندیش یا سازشیوں کے آلہ کار زعمائے ملت آگے آئے اورانہوں نے حالات کی تاروں سے احراریوں کے لیے ایسا پھندا تیار کیا کہ اگر احراری اس میں گھستے، تب تو مارے ہی جاتے، نہ گھستے، تب بھی بساط سیاست پر انہیں شہ مات ہو گئی۔

۱۹۷۹ء میں خمینی صاحب کا انقلاب، ایران میں نمودار ہوا۔ اس کے اثرات پاکستان پر بھی پڑے۔ خمینی صاحب سے مذہبی رشتہ رکھنے والوں کے دلوں کا زہر زبانوں سے ٹپکنے لگا۔ یہاں بھی ایسے ہی انقلاب کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اسی کی پشت پناہی سے شیعہ سنی نصاب کی علیحدگی عمل میں آئی۔ شیعہ سنی منافرت پہلے سے موجود تھی اور علماء اس پر کام بھی کر رہے تھے، مگر انقلاب کی آمد نے اس منافرت میں شدت پیدا کر دی۔ اب دو ہی راستے تھے۔ ایک یہ کہ کچھ پروا نہ کی جائے اور جو جس کام میں لگا ہے، لگا رہے۔ بظاہر تو یہ رویہ اس فتنے کو بڑھانے والی بات تھی، مگر اس کے نتائج اہل سنت کے حق میں دور رس ہوتے۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ اس پر ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی جائے۔ اس کی بھی دو صورتیں تھیں۔ ایک جارحانہ، دوسری مدافعانہ۔ جارحانہ راستہ قانون شکنی کا راستہ تھا اور وہ تمام باتیں اس کے لیے لازم تھیں جو قانون شکنی کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ جن حضرات نے اس کا بیڑا اٹھایا، انہوں نے جارحانہ رویہ اختیار کیا۔ ایک تو یہ کہ وہ خود گرم مزاج تھے اور سیاسی سست روی سے ان کی شناسائی نہیں تھی۔ دوم، حالات بھی ایسے بن رہے تھے جو فوری شدید ردعمل کا تقاضا کرتے تھے۔ تیسرا یہ کہ انھی کے علاقوں میں صحابہ کرام کے خلاف دریدہ دہنی عروج پر تھی۔ چنانچہ یہ تحریک شروع ہوئی اور بہت کم وقت میں نہ صرف یہ کہ مقبول ہوئی بلکہ تمام حدیں بھی عبور کر گئی۔ ایسی تحریکیں ہمیشہ ساون کی گھٹا، سیلاب کا ریلا اور آندھی کا جھکڑ ہوتی ہیں۔ دھواں دھار برستی اور ختم ہو جاتی ہیں۔ جتنی تیزی سے یہ تحریک ابھری، اتنی ہی تیزی سے سمٹ بھی گئی۔ جذبات کا مد بہت جلد سیاست کے جزر کا شکار ہو گیا۔ کثیر تعداد میں جید علماء کرام اور سرفروش کارکنوں کے شہید لاشے اٹھانے کے بعد اس نے اپنا سلوگن ہی تبدیل کر دیا۔ یہ تحریک گو کہ چند موڑ کاٹ کر وہیں آ کر رک گئی جہاں دور اندیش نظریں پہلے ہی اسے دیکھ رہی تھیں، مگر کم از کم دیوبندیوں کی قوت

اس سے کئی حصوں میں ضرور تقسیم ہوگئی، کیوں کہ ایک بڑا گروہ کسی صورت اس طرح کے اقدامات کے حق میں نہ تھا۔ ایک ہی جیسے حالات میں دو گروہوں نے ایک دوسرے کے الٹ رائے قائم کی اور یہ اختلاف رائے بالآخر تفریق پر منتج ہوا۔ رہے دشمنان صحابہ تو وہ آج پہلے سے زیادہ مضبوط ہیں۔

۲۰۰۷ء میں لال مسجد اور جامعہ حفصہ کے حوالے سے سازش کی گئی اور ایسے حالات پیدا کر دیے گیے کہ اگر علماء اس تحریک کا حصہ بن جاتے، تب بھی نقصان اٹھاتے اور نہ دیتے، تب بھی مطعون ہوتے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جن علماء نے یہ تحریک اٹھائی، انہوں نے بھی سیکڑوں بچیوں اور جوانوں کے ساتھ جام شہادت نوش کیا اور جنہوں نے مصالحت اور سدھار کی کوشش کی، وہ بھی مطعون ہوئے اور جن علما نے محتاط ردعمل کا مظاہرہ کیا، وہ بھی مجرم قرار پائے بلکہ وفاق المدارس کے ٹوٹنے یا بٹنے کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ اس کا جو کچھ نتیجہ ہوتا، وہ ظاہر ہے۔

۹) **تطرف:** فرقہ بندی کی یہ بھی ایک اہم وجہ ہے۔ ایک بات لوگوں کی نظر سے گزرتی ہے، وہ اسے پڑھتے بولتے اور سنتے رہتے ہیں، مگر ان کے لیے اس میں ایسا کوئی سوال نہیں ہوتا جو عقدۂ لاینحل بن جائے۔ مگر اچانک کسی کے دماغ میں شیطان سرنگ بنا لیتا ہے۔ شک کے کانٹے اگنے لگتے ہیں۔ ایک چیز جو ہزاروں کے لیے بدیہی تھی، اس کے لیے نظری بن جاتی ہے۔ جو دوسروں کے لیے حقیقت تھی، اس کے لیے مجاز ہو جاتی ہے۔ وہ ایک سوال جو اس کے دماغ میں جنم لیتا ہے، اس کے لیے سب کچھ بن جاتا ہے۔ تفویض کا راستہ وہ اختیار نہیں کرتا اور جوابات اسے مطمئن نہیں کرتے۔ بالآخر اسے ایک حل سوجھ جاتا ہے جو اسے مطمئن کر دیتا ہے۔ وہ زور و شور سے اس کی تشہیر و تبلیغ کرتا ہے۔ اگر چہ وہ مزعومہ حل ایک جواب دے کر ہزاروں سوال کھڑے کر دے، مگر اسے اس بات سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس حل پر نظر ثانی کرے، خود اسی کو اصل قرار دے کر باقی تمام مسائل کو اس کے تابع مہمل بنا دیتا ہے۔ ہر مسئلے اور ہر سوال کو وہ اسی کی عینک لگا کر دیکھتا ہے۔ آہستہ آہستہ ایک نیا عقیدہ، نئی تفسیر وجود میں آنے لگتی ہے جو قرآن وسنت کے مجموعی مزاج سے بہت حد تک علیحدہ ہوتی ہے۔ ایک نیا فرقہ پیدا ہو جاتا ہے جو دراصل اس کے بانی مبانی کے تطرف اور انتہا پسند طبیعت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ اگر انتہا پر ہوتا ہے تو اس کے مقابلے میں آنے والے متطرفین دوسری انتہا پر پہنچ کر ایک نیا فرقہ، نئی جماعت اور نئی پارٹی تشکیل دے دیتے ہیں۔

۱۰) **کم علمی:** علم میں کمی بھی سبب بن جاتی ہے نئے فرقے کا، خصوصاً اس وقت جب کم علمی چھپانے کے لیے اس بات کا اظہار کیا جائے کہ وہ بہت زیادہ جانتا ہے۔ جب کم علمی کے ساتھ ساتھ انسان احساس برتری کے مرض کا شکار ہو، اس حالت میں وہ اپنی ہی کہے گا اور اپنی ہی سنائے گا۔ چنانچہ تاریخ سے بعض ایسے لوگوں کے بارے میں یہ شہادت ملتی ہے کہ اپنی کم علمی بلکہ لاعلمی کے باوجود انہوں نے کسی مسئلے پر اپنی رائے کو حرف آخر سمجھتے ہوئے اس کا اظہار کیا اور انجام کار ایک فرقے کے بانی ہونے کا تمغہ لے کر رخصت ہوئے۔ (جاری)